امام حسنؑ اور اخلاق

عمادالعلماء علامہ سید علی محمد نقوی صاحب قبلہ

ولادت:۱۵؍رمضان ۳ھ / شہادت:۲۸؍صفر ۵۰ھ

اگر مذہب کا سہارا لئے بغیر اس مادی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے جو صرف قیاس آرائیوں سے مرتب ہوئی ہے تو محسوس ہوگا کہ انسان کی اولین تخلیق وسط ایشیا کے کسی علاقہ میں ہوئی تھی۔

اس وقت کا انسان کیسا تھا اور اس کے عادات واطوار کیا تھے؟ ان سوالوں کا جواب دینا آسان نہیں ہے چونکہ اس دور کے متعلق یہ تاریخ خاموش ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں اس دور سے انسانی زندگی کی جھلکیاں ملنا شروع ہوتی ہیں جب آدمی پہاڑ کے درّوں اور گھاٹیوں میں زندگی گزارتا تھا۔

سمجھا جاتا ہے کہ اس وقت کا انسان جیسا ہے ویسا اس دور کا ابن آدم نہیں تھا۔ اس وقت کے انسان کے اخلاق واطوار سب ابتدائی منزلوں میں تھے اور اس میں اور آج کے انسان میں زمین وآسمان کا فرق تھا مگر اخلاقی جوہر انسانی خمیر میں کسی نہ کسی حد تک روز آفرینش ہی سے موجود رہتے ہیں۔ اور وہ اس کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے رہے ہیں۔

دور ماقبل تاریخ کے انسان کی جھلکی جو آج نقوش وتصاویر کے قالب میں ہم تک پہنچی ہے۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت کے انسان میں کچھ نہ کچھ اخلاقی جوہر تھے کہ نہیں۔۔۔؟ آج سے پندرہ ہزار برس قبل جب انسان غاروں میں زندگی گذارتا تھا، جنگلی جانوروں کا شکار کرتا اور ان کا گوشت کھاتا تھا۔ صبح ہوئی اور وہ اپنے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، اس موقع پر ایک دن جب پوری جماعت شکار پر جانے کے لئے تیار ہوئی، اس وقت ان میں سے ایک آدمی بولا۔۔۔دوستو! آج میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ مہم پر نہ جاؤں۔ اگر اجازت دو تو میں یہیں رک جاؤں۔۔۔اس کے ساتھیوں نے اسے اجازت دے دی۔ اس طرح اس آدمی نے شکار پر جانا چھوڑ دیا اور شام کو جب اس کے ساتھی شکار لاتے تو کھانے کے لئے تیار ہوجاتا۔ بظاہر یہ سست اور کام چور تھا۔ مگر بقول ایک مغربی نقاد ''وھسکو'' کے یہ آدمی غار میں پڑے پڑے اپنے ساتھیوں کی کامیابی کے خواب دیکھا کرتا تھا اور ان جانوروں کی تصویریں بنایا کرتا تھا جن کو اس کے ساتھی شکار کرنے جاتے تھے۔

یہ انسان دنیا کا پہلا فن کار ومصور تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس واقعہ میں اس کے بھی شواہد فراہم ہوجاتے ہیں کہ اس وقت بھی انسان میں اخلاقی جوہر موجود تھے۔۔اگر انسانیت سے کام نہ لیتے تو اس کے ساتھی ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو کبھی شکار کرنے سے چھوٹ نہ دیتے۔ اور اگر اسے اپنے ساتھیوں سے محبت وہمدردی نہ ہوتی تو یہ ایسی تصویریں نہ بناتا جن کا تعلق براہ راست انھیں سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اخلاقی اوصاف شروع ہی سے موجود تھے اور برابر مائل بہ ارتقاء رہے۔

اگر نگاہ دوربیں سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حیوان پر انسان کو جو تفوّق حاصل ہے۔ اس میں علم وعقل ونطق کے علاوہ اخلاقی اقدار کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ارسطو کی منطق میں ناطق کے ایک خودساختہ معنی کلیات کا ادراک کرنے والے کے قرار دے لئے گئے ہیں۔ ورنہ عام طور پر ناطق کا مفہوم جو سمجھ میں آتا ہے وہ بولنے والا ہی ہے، اور اس لحاظ سے اگر صرف حیوان ناطق ہونا انسان ہونے کا معیار بن جائے تو بہادر شاہ والیٔ گجرات کے طوطے کو بھی انسانی صف میں جگہ دینا پڑے گی جس نے اپنے آقا کو شکست دلانے والے، نمک حرام رومی خان کا راز ہمایوں بادشاہ کے بھرے دربار میں افشاء کیا تھا۔ عقل کو بھی عام معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں بھی کسی نہ کسی حد تک بعض حیوان شریک ہیں۔ جہاں تک علم کا سوال ہے، یہ انسان کی مخصوص جاگیر نہیں، بلکہ حیوان کو بھی ایک حد تک علم حاصل رہتا ہے۔ درحقیقت وہ عقل جو آدمی کا طرۂ امتیاز ہے علم اور اخلاق دونوں کو بروئے کار لاسکنے والا جوہر ہے اور جب یہ دونوں صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں تو آدمی واقعی انسان بن جاتا ہے۔ انسانیت واخلاق لازم وملزوم ہیں اور جیسا کہ پہلے کہا گیا یہ کسی نہ کسی حد تک ہر دور کے انسان میں موجود رہا ہے۔۔۔ بلکہ آدمی اخلاق ہی کا عصا تھام کر ''انسانیت'' کے بلند منازل طے کرتا رہا ہے۔

اسی انسانیت کی تکمیل کو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اپنا نصب العین بتایا ان الفاظ میں کہ ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ''میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ انسانی کو معراج کمال تک پہنچاؤں۔''

چنانچہ تاریخ عالم کی یہ بدیہی حقیقت ہے کہ بعثت رسولؐ کے بعد آپ کے خاص تربیت کردہ افراد اخلاقی اعتبار سے جہاں پہنچ گئے وہ انسانیت کی انتہائے ترقی کی آخری حد ہے۔ اور خود پیغمبرؐ اسلام کو شروع میں تقریباً تنہا اور پھر ایک مختصر جماعت کے ساتھ ہونے کے باوجود دنیائے کفر وشرک پر جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں ان میں اخلاقی اسلحہ کا یقیناً شمشیر وسنان سے زیادہ ہاتھ تھا۔

نپولین بوناپورٹ کا قول بھی ہے کہ اخلاقی طاقت جسمانی طاقت سے کم از کم تین گنا زیادہ اہم ہوتی ہے اور پیغمبرؐ کی تعلیم پر کچھ بھی جو عمل کرنے والے تھے وہ اسی طاقت سے سرشار تھے۔۔۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا دشمن تک اعتراف کرتے رہے ہیں۔

تاریخ میں ہے کہ جس وقت روم کے عساکر قاہرہ سے نہتے عربوں کا مقابلہ ہوا اور تمام آلات حرب وضرب سے لیس ہونے کے باوجود رومیوں کو پے بہ پے شکستوں کا منھ دیکھنا پڑا، اس وقت شہنشاہ ہرقل نے اپنے ماہرین دفاع کو طلب کرکے ان سے ناکامی کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ: ''عرب تعداد میں کم ہیں ان کے آلات حرب وضرب تمہارے مقابلے میں نہایت حقیر، ناقص اور دقیانوسی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے عظیم الشان لشکر ان کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر پاتے؟'' اس موقع پر سب خاموش ہوگئے مگر ایک

کہن سال بہادر نے اٹھ کر جو کچھ کہا وہ ہمارے بیان کا بولتا ثبوت ہے۔اس نے کہا کہ عالی جاہ! ''عربوں کی فتوحات کا راز ان کی اخلاقی قوت میں پنہاں ہے۔وہ رات کا کچھ حصّہ اپنے خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں کسی انسان پر ظلم نہیں کرتے۔ باہم اخوّت ومساوات سے رہتے ہیں، یہ چند اسباب ہیں جن کی بناء پر وہ دلیر وبہادر ہیں ان کا عزم پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔''

پھر رسول اسلامؐ سے تقریباً چار سو سال بعد صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کو جو فتوحات حاصل ہوئیں اور صلاح الدین ایوّبی نے جس طرح عیسائیوں کو کچلا، اس کا اصل سبب بھی ٹی۔اے۔آرچر اور چارلز کنگز فور نے اپنی کتاب ''قوموں کی تاریخ''، صلیبی جنگ میں مسلمانوں کی اخلاقی برتری اور عیسائیوں کی روحانی پستی ہی کو قرار دیا ہے۔۔۔

مسلمانوں میں اخلاق کا یہ پرتو اس کے بعد تھا جب کہ وہ ۱۰ھ کے اسلامی جذبات تقریباً فنا کر چکے تھے۔اور انھوں نے قیصر وکسریٰ کی جگہ لے لی تھی۔

مسلمانوں کو یہ اخلاقی عظمت جو مٹنے پر بھی دنیا کو متاثر بناتی تھی رسولؐ اسلام اور ان کے گھرانے کے دوسرے کامل انسانوں کی بدولت حاصل ہوسکی۔انھوں نے نہ صرف اپنے اقوال سے روحانیت واخلاق کو اہل اسلام کے خمیر میں گھولنے کی کوشش کی بلکہ اپنے عمل سے ایک انمٹ نمونہ قائم کردیا۔

اس سلسلہ کی ایک ممتاز فرد حضرت امام حسنؑ ہیں۔ جس طرح تصویر کو نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد کے نقوش ابھارے جائیں بالکل اسی طرح اگر کسی شخص کے کردار کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو بہت ضروری ہے کہ اس کے ابتدائی ماحول پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ کسی انسان کو ظاہری اسباب کے لحاظ سے اس کے ماحول سے الگ کرکے صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔

ہجرت کے تیسرے سال حضرت کی ولادت ہوئی اور ابھی سات ہی برس کی عمر تھی کہ نانا کا انتقال ہوگیا اور چند ہی مہینہ کے بعد ماں بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

اب امام حسنؑ کے لئے صرف حضرت علی -کی ذات بزرگ کی حیثیت سے رہ گئی۔مگر یہ وہ دور تھا جب اقتدار مملکت اسلامی اہل دنیا کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ امیرالمومنینؑ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ شیر خدا برسر اقتدار جرگے کے عتاب کا شکار تھا۔ ہر دم اہلبیتؑ کے لئے تازہ آلام ومصائب کا پیغام بن کر آتا تھا۔اگرچہ نبی وامام مکمل پیدا ہوتے ہیں مگر عام طور پر سات سال سے آغاز شباب تک کا زمانہ نمایاں حیثیت سے کردار سازی کا دور ہوتا ہے۔اس دور میں جو خیالات انسان کے دل ودماغ میں سماجاتے ہیں اور کردار جس سانچے میں ڈھل جاتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت سے عمر کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔۔۔امام حسنؑ کی عمر کا یہی حصہ خاص طور پر تکالیف وآلام کی آماج گاہ رہا۔

ماں کا کہنا کہ ''مجھ پر وہ مصائب پڑے ہیں جو اگر دنوں پر پڑتے تو وہ رات ہوجاتے۔'' کیا حسن مجتبیٰ کے نازک دل کی دھڑکن کو تیز تر نہ کردیتا ہوگا۔اور پھر مشفق اماں کی ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے جدائی۔ اس وقت امام حسنؑ کی عمر کا ایک عام ذہین بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ میری ماں کے خون سے کس کس کا دامن آلودہ ہے۔ حضرت علیؑ پھر بھی کمال شباب کی منزل پر تھے۔ شیر خدا کے اگر بازو پھڑکتے ہوں گے تو تلوار کی طرف دیکھ لیتے ہوں گے۔ چاہے پھر اسلام کا پاس کرتے ہوئے اس کو نیام میں رہنے دیتے ہوں۔۔۔ مگر حسنؑ یقیناً طفلی کی وجہ سے اپنے کو بے بس محسوس کرتے ہوں گے۔ اور پھر پچیس برس تک برابر حسنؑ مجتبیٰ کے لئے یہی گھٹی گھٹی فضا رہی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی ذات میں ایسے طویل پُرآشوب دور کے منفی اثرات رچ بس جاتے۔ گوشہ نشینی کی عادت ہوجاتی۔ ایسی بے کسانہ زندگی سے طبیعت میں چڑچڑاپن آجانا چاہئے تھا۔ قوت برداشت کو جواب دے دینا چاہئے تھا۔ انسان کو ہر وقت موت کو اپنا مسیحا سمجھ کر اس کے انتظار میں رہنا چاہئے تھا۔ قوت عمل سلب ہوجانا چاہئے تھی۔ شروع سے ایسی زندگی گزارتے گزارتے جب گھر میں تین تین دن تک فاقے ہو رہے ہوں۔ انسان کو بخیل ہوجانا چاہئے۔ غرض اگر اور کوئی غنچہ ہوتا تو بادسموم کے جھونکوں سے بن کھلے مرجھا گیا ہوتا۔ مگر امام حسنؑ نے اس ماحول میں رہتے ہوئے اپنے کو تمام منفی اثرات سے محفوظ رکھا۔ ان کی طبیعت میں چڑچڑے پن کے بجائے خوش خلقی آگئی۔ بخل کے بجائے جودوکرم نے بڑھ کر قدم چومے۔ تشکیک پسند ہونے کے بجائے ان کی رگوں میں قوت یقین خون بن کر ڈوڑنے لگی۔

ظاہری اسباب کے لحاظ سے ان تمام فضیلتوں کے حاصل ہونے میں امام حسن ۔ کی فطری افتادطبع کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ کی صحبت کا بھی اثر ماننا پڑے گا۔ امام حسنؑ یقیناً گوشہ تنہائی میں پل رہے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ علیؑ مرتضیٰ جیسے کردار وعمل کے مرد میدان کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ یقیناً بظاہر مفلسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اس انسان کے فرزند وجانشین تھے جس کے نام سے اب بھی بڑے بڑے صاحب اقتدار کانپ اٹھتے تھے۔ اس لئے ان میں دولت کی لالچ کے بجائے سیر چشمی پیدا ہوگئی۔۔۔ حسنؑ مجتبیٰ اس کے زیر سایہ بڑھ رہے تھے جو خود تین دن کے فاقے سے رہ سکتا تھا۔ مگر کسی یتیم، فقیر اور اسیر کو اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں پلٹا سکتا تھا۔ اس لئے ان کی فطرت میں جودوکرم کا جوہر پیدا ہوجانا فطری تھا۔ حسنؑ مجتبیٰ علیؑ کی صحبت میں دن رات بسر کر رہے تھے۔ جنھوں نے دنیا کی ہر تکلیف اٹھا لی مگر یہ برداشت نہ کیا کہ اسلام کے کسی مقصد کو ٹھیس لگ جائے اور مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوجائے۔ اس لئے حسنؑ مجتبیٰ کے روئیں روئیں میں شریعت اسلامی اور مسلمانوں کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ جس کا مظاہرہ ان کی زندگی کے آخری لمحے تک ہوتا رہا۔ غرض ذات شبری میں ان اوصاف کے پیدا کرنے میں امیر المومنینؑ کا نمایاں حصّہ ثابت ہوتا ہے۔ مگر امام حسنؑ کی سیرت کی وہ خصوصیت جس سے ان کی ذات کو وہی نسبت ہے جو خوشبو کو مشک وعنبر کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ صفت حلم وبرداشت ہے ملکہ تو نفس سے متعلق چیز ہے مگر جس طرح نور کے نمایاں کرنے میں ظلمت کا بڑا دخل ہے اسی طرح حسنؑ مجتبیٰ

کی اس صفت کے نمایاں کرنے میں اہل اقتدار کا بڑا دخل ہے۔ حضرت کی زندگی کے آنگن میں ہم برابر تحمل و برداشت کی دھوپ چھاؤں دیکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ حلم ذات شبری پر ایسا چسپاں ہو گیا ہے کہ جب بھی کوئی اس صفت کا ذکر کرتا ہے فوراً ہمارا تصور امام حسنؑ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ان حالات کو پیش نظر رکھیں جن میں حضرت کا بچپن گزرا اور پھر جس طرح اہل اقتدار نے ذاتِ حسنؑ کو نشانہ ظلم وستم بنایا اور اس کے بعد اپنے دوستوں کی کجروی اور امیر معاویہ کے شدائد سے سابقہ پڑا تو یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی کہ اگر امام حسنؑ کی ذات میں یہ ملکہ غیر معمولی حد تک نہ ہوتا تو مصائب وآلام کے ان نشتروں کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ اور قوت برداشت کا یہ مادہ دراصل ان جانسوز حالات کا ایک تندرست وتوانا شخصیت پر ردّعمل تھا۔

جیسا کہ کہا گیا امام حسنؑ کی پوری زندگی صبر وتحمل ہی سے عبارت ہے، مگر یہ صفت اس وقت سے ابھر کر سامنے آ گئی جس وقت سے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شہادت ہوئی۔ اور مسلمانوں نے حسنؑ مجتبیٰ کو اپنا خلیفہ مقرر کر لیا اور پھر امیر شام معاویہ کی دراندازیاں شروع ہوئیں اور ایک ایک کر کے حضرت کے ساتھیوں نے دغا دینا شروع کر دی۔ اور ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا شروع کر دیا ظاہر ہے کہ جب ؎

دوست پھر جائیں تو دشمن کی شکایت کیا ہے

امام حسنؑ کے دل پر اپنے بعض نام نہاد ساتھیوں کی غدّاریوں کا جو اثر ہوتا ہوگا اس کو ہر صاحب دل محسوس کر سکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے دشمن تکلیف پہنچائے تو اذیت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا اس وقت ہوتا ہے جب وہی چوٹ کسی دوستی کے دعویدار سے لگے۔ چونکہ دشمن سے تو اس کی امید ہوتی ہی ہے کہ وہ ایسا کرے گا۔ مگر انسان دوستوں کے سہارے عموماً نہ جانے کتنی جنتوں کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ اور جب بہشت تخیل کا یہ طلسم ٹوٹتا ہے، اس وقت انسان کو جو روحانی اذیت پہنچتی ہے وہ قابل بیان نہیں ہوتی۔ مگر یہ امام حسنؑ کی غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جسکی وجہ سے وہ ان تمام چوٹوں کو سہہ گئے۔۔۔اس طرح بہت سے دوستوں کی غدّاریوں کے بعد امام حسن ۔ نے ایک جلسہ عام میں باقی ماندہ ساتھیوں کو مخاطب کر کے معاویہ سے صلح کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا اور ان شرپسندوں نے جو امیر شام کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کے لئے بیتاب تھے اور بہانہ تلاش کر رہے تھے، اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے امیر کے خلاف شورش کر دی۔ تاریخ یہاں تک بتاتی ہے کہ اس ہنگامہ میں بعض مفسدوں نے حضرت کے قدم کے نیچے سے مصلیٰ تک گھسیٹ لیا اور امام کو متعدد جراحتیں بھی پہنچیں۔ اس وقت بھی انھوں نے حلم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آخر کار صلح ہو گئی اور معاویہ نے دوسری شرطوں کے ساتھ یہ شرط بھی منظور کر لی کہ شیعان علیؑ کو اذیت نہیں پہنچائی جائے گی، اور امام حسنؑ ہر طرح محفوظ رہیں گے، اور جہاں حسنؑ مجتبیٰ موجود ہوں گے وہاں حضرت

علیؑ کو برا بھلا نہیں کہا جائے گا۔ مگر تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی امیر شام نے اعلان کر دیا کہ صلح نامے کے تمام شرائط میرے قدموں تلے ہیں، جب چاہوں گا پامال کردوں گا۔۔۔اگر کوئی اور ہوتا تو وہ اتنے ہی پر مشتعل ہوجاتا۔ مگر یہ امام حسنؑ تھے جنھوں نے اس موقع پر بھی قوت برداشت کو کام میں لاتے ہوئے کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ مدینہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر آنے والے وقت کی ہولنا کیوں کا انتظار کرنے لگے۔

اور اس وقت کے آنے میں دیر نہیں لگی۔ جب تمام اسلامی سلطنت میں شیعیانِ علیؑ کا قتل عام شروع ہوگیا۔ شاہراہوں پر اور مسجدوں میں امیرالمومنینؑ پر دشنام طرازیاں عام ہوگئیں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کا برسرِ عام مذاق اُڑایا جانا شروع ہوگیا۔ اور اپنے اس خالق کا نمائندہ جس نے نمرود اور فرعون کو مدّتوں ان کی سرکشی میں ڈھیل دی۔ اپنے زبردست مادّۂ حلم کی بدولت خاموش رہا۔ اور طوفانِ گمراہی کو بڑھنے دیا۔ تاکہ پانی سر سے گزر جائے اور آنے والی نسلوں کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل نہ پیش آئے کہ ''کون کیا تھا'' کون ظالم تھا کون مظلوم۔ کون پاسبان شریعت اسلامی تھا اور کون سببِ زوالِ مُسلم۔

آج ہم تیرہ چودہ صدیوں کے بعد امام حسنؑ کی اس دور اندیشی کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر امام حسنؑ اتنی زبردست قوت برداشت کا ثبوت نہ دیتے اور امیر شام کے خلاف علم جہاد بلند کر دیتے تو دنیا زیادہ سے زیادہ انھیں عبداللہ بن زبیر یا حضرت زید کی صف میں جگہ دے دیتی، جنھوں نے اہل اقتدار کے خلاف علم مخالفت بلند کیا تھا اور اس کے بعد اگر اہلبیتؑ پر بنی امیہ کی طرف سے مصائب کے پہاڑ توڑے جاتے تو اس کی حیثیت جوابی کارروائی کی ہوجاتی۔۔۔ یہ امام حسنؑ کا ابتدائے دور مصائب میں حلم وصبر تھا جس نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا کہ دراصل بنی امیہ کا مقصد اہلبیتؑ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا اور ان کو اذیت وتکلیف پہنچانا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے واقعۂ کربلا کے ''معصوم'' ہونے کی ضمانت لے لی۔ مگر اپنے مقصد کے حصول میں سبطِ نبیؐ کو کتنی زبردست قوت برداشت کا ثبوت دینا پڑا۔ اس کے تصوّر سے انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں یہی مصائب کیا کم تھے جو ان کو اپنے دوستوں کی شہادت اور اسلام کی بے حرمتی سے پہنچ رہے تھے اسی کے ساتھ ان ''دوستوں'' نے بھی جو کل تک آپ کو ''امیرالمومنین'' کہتے تھے اب ''مذل المومنین (مومنین کو ذلیل کرنے والے) کہنا شروع کر دیا۔ لیکن امام حسنؑ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔۔۔ غرض تحمّل و برداشت کی صفت، کردارِ حسنی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ آپ کی طبیعت میں جھنجلاہٹ اور چڑچڑاہٹ بالکل نہیں تھی بلکہ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ عمر بن اسحاق کا قول ہے کہ میں نے امام حسنؑ کو کبھی کوئی سخت بات کہتے نہیں سنا، ایک بار عمر بن عثمان پر بہت غصہ آ گیا تھا جب اس نے آپ کے ایک مشورے کو قبول کرنے

سے انکار کر دیا تھا، اس وقت میں نے حسنؑ مجتبیٰ کی زبان سے سنا تھا۔ ''ہمارے پاس ان کی ناک کو مٹی پر رگڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔'' یہ گویا وہ سخت ترین جملہ تھا جو کبھی امامؑ کی زبان پر آیا۔۔۔اسی کے ساتھ ساتھ ایثار کی صفت بھی کردار حسنؑ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

دنیا میں اب تک جتنی تباہیاں آئی ہیں، وہ چند افراد یا بعض قوموں کے خود غرض مفاد کے ٹکراؤ کا نتیجہ رہی ہیں۔۔ اگر ایک گروہ دوسرے کے لئے ایثار کرنے پر آمادہ ہوجایا کرتا تو نہ کوئی جنگ رونما ہوتی، نہ کوئی فتنہ وفساد برپا ہوتا۔

اسلام کی تعلیم ابتدا ہی سے یہ رہی ہے کہ مسلمانوں کو بلند مقاصد پیش نظر رکھ کر فیصلے کرنا چاہئے۔ اور ذاتی وشخصی مفاد کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔۔۔اسلام کے سچے رہنما اسی پر عمل کرتے رہے ہیں۔

امام حسنؑ نے بھی اپنے آئینی حق خلافت ظاہری سے دست بردار ہوکر ثابت کر دیا کہ وہ اسلامی مصالح کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد سے بلند خیال کرتے ہیں۔

خلافت کی گدّی کوئی معمولی چیز نہیں تھی بلکہ امام حسنؑ تک آتے آتے سلطنت اسلامی کی سرحدیں روم وفارس کی عظیم الشان حکومتوں کو اپنے دامن وسعت میں جگہ دے چکی تھیں۔۔۔اسلامی خلیفہ ایک عظیم الشان اور بڑی قوم وسلطنت کا آئینی ومذہبی سربراہ ہوتا تھا۔

جس وقت ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو امام حسنؑ کے انمول ایثار کی قیمت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ تاریخ کا ایک طالب علم جانتا ہے کہ کس طرح دنیا میں معمولی صوبوں کی گورنری پر خوں ریزیاں ہوتی ہیں اور بھائی کو بھائی اور باپ کو بیٹے نے قتل کیا ہے، مگر امام حسنؑ نے ثابت کر دیا کہ اگر کوئی مقصد پیش نظر ہو تو اس پر سے ایسی ایسی ہزاروں ''خلافتیں'' قربان کی جاسکتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ امام حسنؑ میں ہمت وشجاعت وجواں مردی کی کمی تھی اس لئے آپ کو ''چپ چاپ'' تخت خلافت امیر معاویہ کے حوالے کر دینے ہی میں اپنی سلامتی نظر آئی، لیکن اگر اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے پچیس برس جس طرح خاموشی کے ساتھ گزار دیئے اور جس طرح ہاتھوں میں رسّیاں بندھوا لیں یہ (معاذ اللہ) ہمت وشجاعت کی کمی کی وجہ سے تھا مگر علیؑ کی شجاعت وہمت تو ضرب المثل ہے اور آج تک کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی، بلکہ اس کی وجہ یہی قرار دی جاتی رہی کہ اسلامی شیرازہ کو بکھرنے سے بچانے کے لئے فاتح بدر وحنین وصفین ونہروان کی تلوار اتنے طویل عرصے تک نیام میں رہی۔ پھر امام حسنؑ پر اس الزام دھرنے کی وجہ جواز کیا ہوسکتی ہے۔۔۔؟

حسنؑ مجتبیٰ کی صلح بھی حضرت علیؑ کے سکوت ہی کی طرح اسلام کی خاطر تھی۔ اس کا ثبوت امام حسن -کے خطبوں میں بھی ملتا ہے۔ صلح کے پہلے ایک خطبے میں امام حسنؑ نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ۔۔۔ ''اے لوگو! میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ نہیں ہے

اور میں مسلمانوں کا باہمی اتحاد ان کے بکھرنے سے کہیں زیادہ بہتر قرار دیتا ہوں۔ اس لئے تم کو میرے کسی حکم کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔'' (جلاء العیون، ص ۲۶۸)

یہ حکم کیا تھا؟ یہی کہ امام حسنؑ معاویہ کے حق میں دستبراد ہو جائیں اور مسلمان اسے تسلیم کر لیں۔ ایسا کس وجہ سے؟ یہ امامؑ کے خطبے کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ تا کہ مسلمانوں میں خانہ جنگی اور نفاق نہ ہو سکے۔

حسنؑ مجتبیٰ نے ایک بلند مقصد کی خاطر خلافت ظاہری سے دستبردار ہو کر ایثار کا جو روشن نمونہ پیش کر دیا، اس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ان کے دور کے نام نہاد مسلمان، اخلاقی اعتبار سے اتنے پست ہوں کہ انھوں نے اس ایثار کی قدر نہ کی ہو بلکہ یہ کہتے ہوئے اپنے امیر پر حملہ کر دیا ہو کہ۔۔۔ ''آج حسنؑ نے اسی طرح کفر اختیار کیا جس طرح ان کے والد نے (صفین میں صلح کر کے) کفر اختیار کیا تھا۔'' اور اسی سے ظاہر ہے کہ یہ درحقیقت خوارج کے مسلک والے لوگ تھے جو جنگ میں حصہ لینے کے لئے آپ کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔

امام حسنؑ کے اخلاقی اوصاف میں جود و کرم کا بھی نمایاں مقام ہے۔ ان کی زندگی میں ایسے بہت سے موقع ملتے ہیں جب انھوں نے مفلسوں اور بے نواؤں کی دستگیری کی ہے، تین دفعہ تو انھوں نے اپنی کل دولت راہ خدا میں لٹا دی۔

اس کے علاوہ آپ کی سخاوت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور اس نے سوال کیا، حضرت نے چار سو درہم کے لئے حکم فرمایا، کاتب نے غلطی سے چار ہزار دینار لکھ دیا۔ جب وہ نوشتہ امام حسنؑ کے پاس آیا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا ''کہ وہ چار سو درہم کا میرا عطیہ تھا اور یہ چار ہزار دینار میرے کاتب کی بخشش ہے۔'' اس طرح اس محتاج کو چار ہزار دینار اور چار سو درہم مل گئے۔

اسی طرح یہ روایت بھی پکار پکار کر حسنؑ مجتبیٰ کی سخاوت کا اظہار کر رہی ہے کہ ایک بار ایک شخص سبط نبیؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ ''اے فرزند امیر المومنینؑ، میرا ایک دشمن جانی ہے جو نہ بچوں کی معصومی کا خیال کرتا ہے اور نہ بوڑھوں کی ضعیفی کا''۔۔۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ کون دشمن ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ یا حضرت! یہ میری تہی دستی و مفلسی ہے۔'' حضرت نے تھوڑی دیر غور و فکر فرما کر اپنے خادم کو حکم دیا کہ ''میرا جتنا بچا ہوا سرمایہ ہو سب لے آؤ۔'' وہ پانچ ہزار درہم لے آیا اور حضرت نے وہ سب اس فقیر کو دے دیے اور کہہ دیا کہ جس وقت دوبارہ تمہیں تمہارا دشمن ستائے تم اس کی شکایت مجھ سے کرنا، میں تم کو اس سے بچا لوں گا۔'' امام حسن - اتنی غیر معمولی سخاوت سے کیوں کام لیتے تھے؟ اس کا جواب ایک موقع پر انھوں نے خود ہی دیا ہے، جب ان سے کسی نے پوچھا کہ ''ہم دیکھتے ہیں کہ آپ فاقے سے رہتے ہیں پھر بھی کسی سائل کو رد نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے۔۔۔؟ تو آپ نے مافی الضمیر کو یہ کہہ کر ظاہر کر دیا کہ میں خدا کی درگاہ کا سائل ہوں، مجھ کو حیا آتی ہے کہ میں خود بھکاری ہوتے ہوئے کسی بھکاری کے سوال کو

رد کردوں، میرے رب نے میرے ساتھ یہ مہربانی فرمائی ہے کہ وہ اپنی نعمتیں مجھ تک پہنچاتا ہے تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اس کی نعمتیں اس کی مخلوق تک پہنچاؤں۔۔۔اس کے بعد آپ نے جو اشعار پڑھے ان سے محسوس ہوتا ہے کہ خدا کے مخصوص بندے کسی کو کچھ دے کر اس کی پیٹھ پر احسان کا بوجھ نہیں رکھتے، بلکہ اس کے احسان مند ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اسی کی مہربانی سے وہ اس لائق ہو سکے کہ کوئی ان سے سوال کرے۔۔۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب میرے پاس سائل آتا ہے تو میں اس کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے فضل سے مجھ پر فضل آتا ہے۔ کسی بھی جواں مرد کی عمر میں وہ حصہ نہایت ہی عمدہ ہے جس میں وہ سخاوت کرتا ہے۔۔۔امام حسنؑ کے محاسن اخلاق میں انکساری و فروتنی کو بھی نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ وہ انسان جو خود اپنی قوتِ بازو سے کوئی بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے مغرور و متکبر نہیں ہوتا، چونکہ اس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کس محنت و جانفشانی سے اس جگہ پر پہنچا ہے۔ مگر وہ انسان جو کسی بڑے آدمی سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اپنے کو مقتدر اعظم و ارسطوئے دوراں سمجھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ حیثیت بغیر کسی کوشش و کاوش کے ہاتھ آئی ہے۔ امام حسنؑ منفرد شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان کے نواسے اور ایک بڑی ذات کے صاحبزادے تھے۔ مگر انھوں نے اپنی پوری عمر میں کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا جس سے بوئے غرور و نخوت آتی ہو۔ بلکہ عمر بھر انکساری و فروتنی کے ثبوت دیتے رہے۔ ایک روز حضرت امام حسنؑ کہیں تشریف لئے جا رہے تھے راستے میں کچھ فقیر بیٹھے سوکھی روٹی کھا رہے تھے، انھوں نے اپنے امیر سے بھی استدعا کی کہ وہ ان کی عزت افزائی کریں اور ان کے ساتھ جو کچھ حاضر ہے وہ نوش فرمائیں۔''

کوئی اور بڑا آدمی ہوتا تو شاید ناک بھوں چڑھا لیتا کہ انھوں نے مجھے اپنی صف کا کیوں سمجھا اور ان کو اس جرأت کی ہمت کیوں کر ہوئی، مگر یہ اخلاقِ اسلامی کی چلتی پھرتی مورت تھی۔۔۔امام حسنؑ فوراً اپنے اسپ فلک سیر کو روک کر اُتر پڑے اور ان کے ساتھ وہی سوکھی روٹی کھائی۔ اور اس کے بعد ان سب کو اپنے دولت سرا لائے اور ذائقہ دار کھانا کھلا کر اور خلعت وغیرہ سے مالا مال کر کے انھیں رخصت کر دیا۔۔۔ یہ تھا اخلاق حسنؑ۔۔۔۔۔ اگر حسنؑ مجتبیٰ کھانے سے انکار کر دیتے تو ان نادار لوگوں کا دل ٹوٹ جاتا چاہے وہ اسی لئے انکار کرتے کہ ان کے پاس اپنے ہی کھانے کے لئے نہیں ہوگا، میرا بار کیسے برداشت کر پائیں گے۔'' اس لئے ایسا نہیں کیا، مگر اس انسان کامل کو اس کا بھی احساس رہا اس لئے دولت سرا پر بلا کر ان کو اس کھانے سے کہیں زیادہ دے دیا۔۔۔جس کی وجہ سے ان غریبوں کا دل بھی نہیں ٹوٹا اور ان پر بار بھی نہیں پڑا۔۔۔اس کے علاوہ انسان کے لئے ترحّم و ہمدردی کا جذبہ بھی حسنؑ مجتبیٰ کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کا مظاہرہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے ہوتا تھا بلکہ مشرکین و یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ تھا۔۔۔ چونکہ وہ تو اسلام کے اس امٹ اصول پر یقین رکھتے تھے کہ

تمام مخلوق ایک ہی خالق کی پیدا کردہ ہے۔ ایسا تھوڑی ہے کہ مسلمانوں کا پیدا کرنے والا دوسرا ہو اور مشرکین ویہود ونصاریٰ کا خالق دوسرا! پھر یہ کہ حیوانات کا پیدا کرنے والا بھی وہی خدا ہے اس لئے حسنؑ مجتبیٰ حیوانات سے بھی ہمدردی رکھتے تھے جس کا ثبوت وہ واقعہ ہے جو بعض کتب تواریخ میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ جناب امام حسنؑ خاصہ تناول فرمارہے تھے اور ایک کتّا سامنے کھڑا تھا، حضرت ایک لقمہ خود کھاتے تھے اور ایک کتّے کی طرف پھینک دیتے تھے۔۔۔ حاضر الوقت اصحاب میں سے ایک نے عرض کی کہ یا ابن رسولؐ اللہ! اگر اجازت ہو تو میں اسے نکال دوں، حضرت نے جواب دیا کہ ''رہنے دو، مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ کوئی جان دار میری طرف دیکھے اور میں اس کی حاجت براری نہ کروں''۔۔۔ اس واقعہ سے اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک وہ شخص جو کسی کتّے کو بھی بھوکا نہ دیکھ سکتا ہو اور اس کے ساتھ بھی مشفقانہ وہمدردانہ برتاؤ کرتا ہو، اس کا رویّہ نادار انسانوں کے ساتھ کیسا رہتا ہوگا۔۔۔ دراصل یہی اسلامی اخلاق کے وہ لافانی شاہکار ہیں جن سے مسلمانوں کے دل ودماغ ایک عرصے تک منوّر رہے اور جن سے تمام دنیا نے فیض حاصل کیا مگر آج اسی باہمی رواداری کی کمی ہے جو ہمیں قعر مذلت سے نکلنے نہیں دیتی۔

ان تمام اوصاف کے علاوہ امام حسن ـ کے کردار میں خداترسی کی صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔۔۔ جس کا ذکر ملّا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں کیا ہے کہ ''آپ جب حج کو تشریف لے جاتے تو ہمیشہ پیدل جاتے تھے۔ اور جب آخرت کو یاد فرماتے تھے تو بہ آں آ ہنی قوت برداشت گریہ کا غلبہ ہوجاتا تھا اور نعرے مار کر بے ہوش ہوجاتے تھے۔۔۔ اور جس وقت وقت نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ جاتا تھا۔ اور جب بہشت وجہنم کو یاد کرتے تو ایسے مضطرب ہوتے تھے جیسے سانپ یا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔۔۔ یہ حال اس کا تھا جس کو خالق بہشت ودوزخ، جوانان جنت کا سردار بنا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو اپنے خالق سے ڈرے گا وہی اپنی ذات کو حیوانی حرکات سے بچاتا رہے گا۔ اور اس خالق کی خلق کردہ مخلوق کو دوست رکھے گا۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام حسنؑ کی سیرت کے تمام اخلاقی اوصاف کا سرچشمہ، یہی خداترسی تھی جو اپنی جگہ پر خود ایک عظیم اخلاقی وصف ہے۔۔۔ اسلام کے سچے پیرو، صرف ایک ذات سے ڈر کر دنیا کی کسی بھی دوسری ذات سے خوف کھانے کا خیال ترک کردیتے تھے۔ اور کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔۔۔ آج مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہم ایک سے نہ ڈر کر باقی دنیا کی ہر چیز اور ہر فرد سے خوف کھاتے ہیں۔۔۔ غرض امام حسن ـ کی سیرت اخلاقی اعتبار سے نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ دنیا کے ہر ذی عقل کے لئے نمونہ ہے۔۔ اور اس ''نقش کفِ پا'' کے پیچھے پیچھے چل کر دنیا ایک ایسے انسانی نظام حیات تک پہنچ سکتی ہے جہاں ہر ایک شخص انسان ہو۔۔ اور انسانیت کے اس منشور پر ایمان رکھتا ہو جو امام حسن اور اس سلسلہ کے دوسرے رہبروں نے مرتب کیا ہے۔

